© rasailojaraid.com

اقبال اور رومی

از ڈاکٹر سید محمد عبداللہ صاحب ایم اے ڈی لٹ لکچرر پنجاب یونیورسٹی لاہور

اقبال نے رومی سے کیا کچھ لیا ؟ ــــ اس کا جواب دینے کے لئے ہمیں صرف اس قدر سمجھنا ہوگا کہ رومی اور اقبال کے درمیان فکری طور پر کن کن باتوں میں مماثلت موجود ہے ۔ اس کے علاوہ یہ بھی جاننا ہوگا کہ اس فکری مماثلت کے ساتھ ان دونوں بزرگوں کی نفسی ساخت اور ماحول میں کس حد تک یکرنگی پائی جاتی ہے ؟ میرے خیال میں ان دو سوالات کا جواب میرے آج کے موضوع کا ضروری پہلو ہے۔

اقبال نے رومی سے جو جو خیالات لئے. ان کے تذکرے سے یہ نہیں سمجھنا چاہئے کہ وہ خاص افکار، رومی کے علاوہ کہیں اور موجود نہیں ۔ یا اقبال نے رومی کے سوا کسی اور مآخذ سے فیض حاصل ہی نہیں کیا ۔ ایسا سمجھنا یقیناً غلط ہوگا کیونکہ اقبال و رومی کے بیشتر مشترکہ خیالات علیحدہ علیحدہ صورت میں بعض دوسرے صوفیوں اور فلسفیوں کے ہاں بھی ملتے ہیں کچھ فرق ہے تو صرف اسقدر کہ اقبال اور رومی اپنے مجموعی نظامِ فکر کے اعتبار سے ایک دوسرے کے بیحد قریب ہیں اور استفادہ اور کسبِ فیض کے لحاظ سے مجموعی طور پر اقبال نے رومی سے اس درجہ اثر قبول کیا ہے کہ ہم اقبال اور رومی کو ایک دوسرے سے جدا نہیں کر سکتے ۔

اقبال کے ماحول کے متعلق صرف اس قدر بتانا کافی ہے کہ جب اقبال نے فکر کی دنیا میں آنکھ کھولی ۔ اور کائنات اور اس کے مسائل پر نظر ڈالی ۔ تو اس وقت مغربی حکمت اور سائنس کا مادہ پرستانہ نظریہ علم و عمل کے ہر ہر پہلو پر غالب آچکا تھا ۔ طبعی علوم کے انکشافات اور سائنس کی ایجادات کے زیر اثر مذہب ، اخلاق اور روحانیت کی بنیادیں کھوکھلی ہو چکی تھیں ۔ کانٹ ، سپنسر اور مِل کے " ایں جہانی " تصورات اور ہیگل کی جدلی منطق نے مابعد الموت اور اس کے متعلقہ خیالات کے بارے میں شکوک پیدا کرتے ہوئے الحاد ، دہریت اور حیوانیت کے لئے ذہنِ انسانی کے دروازے کھول دئیے تھے ، اس پر ڈاروِن کے نظریۂ ارتقا ، فرائڈ کے نظریۂ جنس اور مارکس کے نظریۂ اقتصاد نے مذہب اور قدیم تمدن کا رہا سہا وقار بھی ختم کر دیا ۔ اور چند سے یہ نظر آنے لگا کہ انسانی زندگی کا سارا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

نظام درہم برہم ہونے کو ہے۔ اور اس دنیائے کون و فساد میں خود غرضی، جدل اور ہوا و ہوس نے خلوص، ایمانداری اور صلح و آشتی کی جگہ لے لی ہے۔ اس کے علاوہ کل کی ایجاد نے انسان کو گوشت، پوست اور ہڈیوں کا بے روح مجموعہ قرار دے کر بدبخت انسان کو روٹی اور غذا تک سے محروم کرنے کی ٹھان لی ہے۔ زندگی مشکل تو تھی مرنا بھی مشکل ہوگیا۔ دنیا جیتے جی جہنم کی آگ میں جلنے لگی۔

ضعفِ ایمان اور بے اطمینانی کے اس گھٹا ٹوپ اندھیرے میں اقبال کی حیرت زدہ آنکھوں نے مغربی علوم پر نظر ڈالی۔ اور چاہا کہ اطمینان اور سکون کی کوئی ایسی شعاع دکھائی دے جس سے دل کے اندھیرے اور ظلمت کو دور کیا جاسکے۔ مگر فلسفہ و دانش کے ان مغربی ضیا خانوں سے اُسے وہ نور کی کرن نہ ملی جس کی اُسے تلاش تھی۔ ان حالات میں اقبال نے محسوس کیا کہ مغربی تہذیب سوزِ یقین سے محروم ہے۔ اہلِ مغرب کی حیاتِ اجتماعی تاجرانہ، عیارانہ اور بے سوز ہے۔ عالمِ انسانیت نظامِ مغربی کے استیلا اور اس کے ایں جہانی تصور سے جگر چاک ہے۔ اس کے امن کی قبا پارہ پارہ اور اس کے سکون کا خرقہ تار تار ہے۔ اور اسے یقین ہوگیا کہ یورپ کی تہذیب ہی انسانی تہذیب کے صالح اور خوشگوار ارتقار کے راستے میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ جس کو ایمان اور یقین کی مدد سے راستے سے ہٹانا بنی نوعِ انسان کا سب سے بڑا فرض ہے۔ اقبال نے اس نصب العین کی طرف بار بار اپنی شاعری اور نثری تصانیف میں اشارہ کیا ہے۔ انھوں نے مقالاتِ مدراس میں بڑی وضاحت کے ساتھ لکھا ہے کہ اس وقت دنیا کو سب سے زیادہ جس بات کی ضرورت ہے وہ یہ ہے کہ انسانی تہذیب کو پھر سے روحانیت سے روشناس کرایا جائے۔ اور اس بات کا یقین پیدا کیا جائے کہ ذاتِ خداوندی موجود ہے۔ اور ان ستاروں کے پیچھے کئی "عوالم" اور بھی ہیں جن کا ادراک عقل کی ظاہر بیں آنکھوں سے نہیں بلکہ کشف اور تجلی کی روشنی سے ہو سکتا ہے۔

اس دشوار اور عظیم الشان کام کی تکمیل کے لئے اقبال نے مولانا جلال الدین رومیؒ کو اپنا رہنما بنایا۔ وہ اقبال کے مرشد ہی نہیں بلکہ محبوب بھی تھے۔ اقبال کو رومی سے محض نطشے۔ برگسان اور کانٹ کی طرح کی فکری وابستگی ہی نہ تھی۔ بلکہ دونوں کے درمیان روحانی اور عاشقانہ رشتہ نظر آتا ہے۔ اسرارِ خودی سے لے کر ارمغانِ حجاز تک رومی ہی اقبال کے خضرِ راہ بنتے ہیں۔ وہی جاوید نامے کے زندہ رود کو آسمانوں کی طلسماتی فضاؤں میں لے جاتے ہیں۔ اور ملاءِ اعلیٰ کے مکینوں سے ان کا تعارف کراتے ہیں اور جب یہ مرید ہندی مقصدِ زندگی کی تکمیل کر چکنے کے بعد اقوامِ مشرق کو آخری پیغام

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

دیتا ہے۔ تو اس وقت بھی یہی رومی ہاتف بن کر مژدۂ انقلاب سناتے ہیں۔ رومی اقبال کی نظر میں کلیم بھی ہیں اور حکیم بھی۔ مجدد بھی ہیں اور مصلح بھی۔ شریعت کے علم بردار بھی ہیں اور طریقت کے اسرار کشا بھی۔ غرض سب کچھ جن کی ہدایت سے عصرِ حاضر اپنی گم گشتہ روشنی اور تابانی کو دوبارہ حاصل کر سکتا ہے اقبال کے اپنے الفاظ میں:۔

علاج آتشِ رومی کے سوز میں ہے ترا ۔۔۔ تری خرد پہ ہے غالب فرنگیوں کا فسوں
اسی کے فیض سے میری نگاہ ہے روشن ۔۔۔ اسی کے فیض سے میرے سبو میں ہے جیحون

گسستہ تار ہے تری خودی کا ساز ابتک ۔۔۔ کہ تو ہے نغمۂ رومی سے بے نیاز ابتک

اقبال نے اپنے مرشد رومی سے بڑے بڑے افکار کے بارے میں جو استفادہ کیا۔ اس کے ذکر سے پہلے یہ سن لینا چاہئے کہ اقبال کے لئے رومی کی داستانِ حیات بھی بے حد جنوں انگیز اور ولولہ خیز ثابت ہوئی۔ علی الخصوص اس کا وہ باب جس کا تعلق شمس تبریزؒ کے عشق سے ہے۔ مولانا رومؒ کی زندگی کا نمایاں امتیازی وصف ان کا جذبۂ عشق، دردمندی اور سوز و گداز تھا۔ مولانا روم رح کو شمس تبریزؒ سے مجنونانہ محبت تھی۔ اور اس حد تک تھی کہ ایک پل ان کے بغیر نہ رہ سکتے تھے۔

کہتے ہیں کہ جب ایک دفعہ شمسؒ کسی بات پر ناراض ہو کر قونیہ سے تبریز چلے گئے تو مولانا پر کھانا پینا حرام ہو گیا۔ آخر خود تبریز گئے اور منا کر لائے۔ شمس تبریزؒ نے مولانا کی زندگی میں انقلاب پیدا کیا۔ وہ پہلے ایک خشک اصولی اور منطقی تھے۔ لیکن شمس تبریزؒ کی ملاقات نے انھیں روحانی اور باطنی کمالات سے آگاہ کیا۔ بقول علامہ شبلیؒ "شمسؒ کی ملاقات سے پہلے مولانا روم کے شاعرانہ جذبات اسی طرح ان کی طبیعت میں پنہاں تھے۔ جس طرح پتھر میں آگ ہوتی ہے۔ شمس رح کی جدائی گویا چقماق تھی اور شرارے اُن کی پرجوش غزلیں"۔ رومی نے بہت سی نظمیں شمس تبریزؒ کے فراق میں لکھیں جن میں انتہائی درد اور بے قراری پائی جاتی ہے۔ مثلاً وہ نظم جس کے تین اشعار یہ ہیں۔

ساربانا! بار بکشا ز اشتران ۔۔۔ شورِ تبریز است و کوئے دلبران
فرِ فردوس است این پالیز را ۔۔۔ شعشعۂ عرش است این تبریز را
ہر زمانے فوجِ روحِ انگیختہ جان ۔۔۔ از فرازِ عرش بر تبریزیان

جب شمس تبریزؒ کا انتقال ہوا تو مولانا پر قیامت گذر گئی۔ مریدانِ با اخلاص اپنے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مرشد کے غم میں ہلاک اور خود مولانا صحرائے جنون میں آوارہ و پریشاں! دراصل محبت بھرے دل کو کسی اور محبوب کی تلاش تھی۔ اس لئے کہ بے کیمیائے مستی تبدیل غم محال است۔

آخر ایک اور بزرگ سے ملاقات ہوئی۔ جن کا نام صلاح الدین زرکوب تھا۔ ان کی صحبت میں مولانا کو تسلی ملی۔ چنانچہ دیوان میں ان کی شان میں بھی غزلیں موجود ہیں۔ جن میں سے ایک غزل کے تین اشعار یہ ہیں:۔

مطربا اسرارِ ما را باز گو — قصہ ہائے جاں خزا را باز گو
ما دہاں بربستہ ایم از ذکر او — تو حدیثِ دلکشا را باز گو
چوں صلاح الدین صلاح جان ماست — آں صلاح جانہا را باز گو

نو سال کے بعد صلاح الدین زرکوب کا بھی انتقال ہوگیا۔ اور رومی کی جانِ دردمند کو پھر وہی قضیہ پیش آیا۔ یعنی وہی جنون و بے قراری! ۔ آخر ان کے دوست اور مرید حسام الدین چلپی ان کے لئے باعثِ تسلی بنے۔ یہی وہ بزرگ ہیں جن کا ذکر مثنوی میں بار بار آتا ہے۔ غرض رومی کی زندگی میں دردمندی اور عشق کی جو فراوانی ہے اس سے کون متاثر نہ ہوگا؟۔ رومی کی اس مجذوبیت سے اقبال بھی بے حد متاثر ہوئے۔

دوسری چیز جس نے اقبال کو اپنے مرشد کا گرویدہ بنایا وہ عقل پرستی کے خلاف رومی کا جہاد اور جذبۂ عشق و ایمان کی طرف ان کی پرزور دعوت ہے۔ اسلام میں عقل پرستی کا مرض فلسفۂ یونان کے ذریعہ پیدا ہوا۔ سقراط اور افلاطون کے "این جہانی" خیالات نے حکمائے اسلام کو اسقدر متاثر کیا کہ ایک عرصے تک خود قرآن پر فلسفۂ یونان کی روشنی میں نظر ڈالی جاتی رہی۔ اس میں شک نہیں کہ فلسفہ کے عام ہو جانے سے فکر اور دماغ کے آزادانہ عمل کو ترقی ہوئی لیکن اس کا بڑا نقصان یہ ہوا کہ قرآن نے مشاہدے، تجربے اور زندگی میں ہر ساعت تغیر اور انقلاب کی اہمیت پر جتنا زور دیا تھا وہ کمزور ہوگیا۔ اسلام نے روح اور ایمان کو ساری زندگی کی بنیاد قرار دیا تھا اور اس ایک اصول کی حفاظت کے ساتھ ساتھ تسخیر کائنات کا جو سبق سکھایا تھا وہ سب کچھ سقراط کے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

علمی اور مجردِ حقایق کے غور و فکر میں گم ہوکر رہ گیا۔ ان عقل پرستوں کی تائید معتزلہ نے کی۔ جس سے خود مذہب اور خدا کی حقیقت معرضِ بحث میں آگئی۔ عقل پرستی کی اس یورش کا مقابلہ اشعریوں نے کیا۔ لیکن انھوں نے عقل انسانی کے کمالات سے ہی انکار کرنا شروع کردیا۔ رومی سے پہلے امام غزالیؒ نے عقل پرستی کا کامیاب مقابلہ کیا۔ اور تصوف کو دین کے نظام میں داخل کرتے ہوئے مذہب کی وجدانی بنیاد کو مستحکم کیا۔ لیکن غزالی کی کڑی اور سخت تنظیم سے فکر آزاد اور تخلیق کی قوتوں کو بہت نقصان پہنچا۔ باایں ہمہ غزالی استدلال اور منطقی قیاس کے یکسر مخالف نہ تھے۔ مگر اس کے برعکس انھیں صوفیوں کی زندگی کے بعض پہلوؤں سے کچھ رغبت نہ تھی۔ حکمتِ غزالی کی اسی خصوصیت کی وجہ سے غزالی اقبال کے محبوب حکما میں سے نہیں ہیں۔

رومی نے اس عقل پرستی کے خلاف زبردست احتجاج کیا۔ اور اگرچہ غزالیؒ اور دوسرے متکلمین عقل پرستوں کو کئی میدانوں میں شکست دے چکے تھے۔ لیکن چونکہ علمِ کلام کی بنیاد بھی بیشتر استدلال اور عقلی قیاس پر تھی۔ اس لئے متکلمین سے عقل پرستی کا کامیاب دفعیہ نہ ہوسکا۔ رومی عقل جزوی کے سرے سے مخالف ہیں وہ عقل کی متعدد اقسام میں سے صرف عقل عقل، عقل کل اور عقل ایمانی کے قائل ہیں۔ باقی سارے نظام کے منکر اور اس سے بیزار!۔ ان کے نزدیک عقل جزوی کی رسائی اصل حقیقت تک نہیں ہوسکتی کیونکہ عقل جزوی سراپا، وہم ظن اور شک میں ڈوبا ہوا ہے۔ عقل جزوی انتشار، بدگمانی خودغرضی اور نفسانیت کا مورث ہے۔ مگر جذبۂ ایمان، جمعیت، اطمینان اور محبت کا خالق۔ رومی استدلالی اور عقلی کیفیتوں پر وجدان اور جذبے کو ترجیح دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک عرفان اور ایمان کا مرکز دل ہے نہ کہ دماغ۔ ان کے خیال میں زیرکی ابلیس کا خاصہ ہے اور عشق آدم کا زیور۔ ان کے نزدیک اہلِ تن کے علوم بے حقیقت مگر اہلِ دل کا علم یار مونس ہے۔ مجذوبیت کے بعد رومی کے فکر کا یہی پہلو اقبال کے لئے سب سے زیادہ جاذب توجہ ثابت ہوا۔ اور سب سے زیادہ انہی افکار کے بارے میں اقبال نے رومی کی خوشہ چینی کی ہے۔

تیسری چیز جسے ہم فکرِ رومی میں بہت نمایاں پاتے ہیں وہ رومی کا نظریۂ فقر ہے۔ اسلام میں تصوف کے عناصر ابتدا سے ہی موجود چلے آتے ہیں۔ اور گو کہ ابتدائی زمانہ کے صوفی بہت ہی برگزیدہ لوگ تھے۔ اور ان کی تعلیم کسی طرح مذہب اور عملی زندگی کے متخالف نہ تھی مگر رفتہ رفتہ نو افلاطونی خیالات، [illegible] تصوف میں دنیا سے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

بیزاری کا عنصر بطور ایک سیاسی عقیدے کے شامل ہوگیا۔ جس سے توکل، تقدیر، فنا اور ترک دنیا کی طرح کے مسائل کی غلط تعبیر پیدا ہوئی۔ یہ فلسفۂ زندگی جس قدر جذبۂ حیات کا قاتل ہے۔ اسی قدر اسلام کی عملی تعلیم کے منافی بھی ہے۔ مولانا جلال الدین رومی نے خود صوفی ہونے کے باوجود اس طرز زندگی بلکہ اس نظریۂ زندگی کے خلاف پرزور آواز بلند کی۔ اور توکل، جبر، کسب اور دین و دنیا کے باہمی تعلق پر، پیہم اور مسلسل، نہایت موثر اور دلنشین پیرائے میں اپنے خیالات کا اظہار کیا۔

افسوس ہے کہ رومی کی یہ تعلیم آہستہ آہستہ پھر ابن عربی کی سوفسطائیت میں ڈوب کر رہ گئی اور اگرچہ مثنوی رومی کا مطالعہ صدیوں سے جاری تھا۔ اور اب تک ہے۔ مگر رومی کے خیالات کی روح رومی کی وفات کے بعد غائب ہوگئی، یہ شرف اور خوش بختی اقبال کے نصیب میں تھی کہ اس کی بدولت رومی کے فکر کو دوبارہ زندگی نصیب ہوئی۔ اور پھر سے اس راہبانہ تصوف کے خلاف ردِ عمل ہوا۔ جس کا سب سے بڑا عقیدہ یہ ہے کہ زندگی ترکِ زندگی کا نام ہے۔

اقبال نے رومی فقر غیور کو اپنی جدید اجتماعی زندگی کی ضرورتوں کے لئے بہترین کیمیائے سعادت پایا۔ چنانچہ سلطانی اور خدمت گری، سروری اور چاکری دونوں حالتوں میں ان کے نزدیک یہ فقر توازن اور اعتدال کا ترازوئے مستقیم بن سکتا ہے۔

ان عناصر سہ گانہ کے بعد میں مختصراً رومی اور اقبال کے (Idealism.) بنی نوعِ آدم کے ممکن عروج اور "مرد کامل" کے متعلق دونوں کے مشترکہ خیالات کی طرف اشارہ کرتا ہوں۔ اقبال آدمِ خاکی کے ارتقائی عروج کے قائل ہیں۔ رومی بھی انسان کو ارتقائی مخلوق قرار دیتے ہیں۔ اقبال اس بات پر عقیدہ رکھتے ہیں کہ آخرکار انسان ماہِ کامل بن کر رہیگا اور خاکیوں کا فروغ نوریوں سے زیادہ ہوجائے گا۔ نہیں نہیں اس سے بھی آگے گذر کر خدائی فضا کے حریم قدس میں داخل ہوجائے گا بلکہ اپنی اصل سے جا ملے گا۔ رومی کے نزدیک روح کو بقائے دائمی حاصل ہے۔ پیکرِ خاکی کی شکست انسانی تکمیل کے راستے میں رکاوٹ نہیں بن سکتی یہی اقبال کے خیالات ہیں۔ رومی موت کو زندگی کا دروازہ خیال کرتے ہیں۔ اقبال بھی موت کو نئی زندگی کی صبح قرار دیتے ہیں۔ رومی انسان کے شخصی بقار کو ممکن خیال کرتے ہیں۔ اقبال بھی یہی استدلال کرتے ہیں۔

غرض یہ اور اس قسم کے بیسیوں مسائل ہیں جو اقبال اور رومی میں مشترک ہیں۔ جن کی پختگی کے لئے ممکن ہے کہ اقبال کے سامنے بعض دوسرے آخذ بھی ہوں لیکن مجموعی نظامِ فکر کے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اعتبار سے اقبال نے رومی ہی کے سرچشمۂ فیض سے استفادہ کیا ہے۔

اقبال اور رومی کی مماثلتوں کے اس تذکرے کے بعد کچھ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ان دونوں کے بعض اختلافی پہلوؤں کا تذکرہ بھی کیا جائے۔ میرے خیال میں اقبال اور رومی کے درمیان سب سے بڑا فرق یہ ہے کہ اقبال کا نقطۂ نظر اپنے دعوے اور تعلیم کے برعکس، محض علمی اور نظری ہے یعنی رومی کے نزدیک جو بات حق الیقین کا درجہ رکھتی ہے۔ اقبال کے نزدیک وہ زیادہ سے زیادہ علم الیقین کی سطح تک آسکتی ہے۔ رومی اور اقبال کی عملی زندگیوں میں جو فرق نظر آتا ہے۔ وہی فرق ان دونوں کے نقطۂ نظر میں بھی ہے۔ اقبال کو جو شکایت رازی اور غزالی سے ہے وہی شکایت ہم کمتر درجے پر اقبال سے کر سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ اقبال سارے دعوے کے باوجود استیلاء، جوش، قوت اور تخلیق کا شاعر ہے۔ جس کے غلو میں بعض اوقات اس کی روحانیت محض سایہ اور عکس بن کر رہ جاتی ہے۔ اقبال کے نزدیک تزکیۂ نفس اور تصفیۂ قلب بڑی چیز ہے۔ مگر اس قدر نہیں جس قدر جنگ و پیکار اور خودی کی نمود۔

یہی وجہ ہے کہ ہم اس کے ابلیس کو بعض اوقات یزداں سے کاندھا ملاتے اور چشمک زنی کرتے دیکھتے ہیں۔ اقبال کا جذباتی اور فکری پہلو مضبوط ہے مگر رومی جذباتی اور جمالیاتی کیفیتوں کے مالک کل ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ رومی کے نَے نامے کے مقابلہ میں اقبال کے پختہ کلام میں ایک بند بھی ایسا موجود نہیں جو رومی کی جمالی کیفیتوں کی برابری کر سکے۔ اقبال کی خودی کا تصور انفرادی اور اجتماعی ہے مگر رومی کے نزدیک خودی کا مفہوم تصوف کے عام معانی کے قریب قریب ہے۔ میں نے اس موقع پر رومی اور اقبال کے جو اختلافات نمایاں کئے ہیں۔ ان سے مقصود صرف اسی قدر ہے کہ اقبال فکرِ رومی کے سمندر کا شناور ہونے کے باوجود اپنے ماحول کے مرعوب کن تصورات سے یکسر بے نیاز نہیں ہو سکے۔ کیونکہ زندگی اپنے حوالی اور گرد و پیش سے کلیتہً منقطع نہیں ہو سکتی۔ یہ حضرت اقبال کے روحانی کمالات کا کرشمہ تھا کہ انھوں نے شک اور ضعفِ ایمان کی اس خوفناک فضا سے نکل کر آج سے سات سو سال پہلے کی ہواؤں میں سانس لینے کی کوشش کی اور انسانیت کی تکمیل کے لئے ماضی کو حال کے ساتھ پیوند دے کر مستقبل کی دیواریں کھڑی کر دیں۔

میں خیال کرتا ہوں کہ رومی کی ایمانی حکمت کے سمندر میں ابھی بے شمار موتی موجود ہیں جن کے حصول کے لئے غواصی کا طریقہ رومی کے مرید مگر ہمارے مرشد اقبال نے ہمیں سکھا دیا ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مآخذ

(۱) اقبال کے منظوم کلام کے علاوہ Six Lectures.
(۲) Dr Abdul Hakim Metaphysics of Rumi.
(۳) مضمون - اقبال رومی ـــــ اور نطشے
(۴) عبدالمالک آروی ـــــ اقبال کی شاعری۔
(۵) میر ولی اللہ کا منتخب مثنوی
(۶) قاضی تلمذ حسین - مرآۃ المثنوی
(۷) شبلی - سوانح مولانا روم۔

ندوۃ المصنفین کی جدید کتاب

خلافتِ بنی امیہ

شائع ہوگئی

یہ ندوۃ المصنفین کی مقبول عام کتاب تاریخ ملت کا تیسرا حصہ ہے جس میں تمام خلفائے بنی امیہ کے حالات وواقعات بڑی کاوش سے قدیم وجدید عربی تاریخوں سے جمع کئے گئے ہیں۔ اخذ وبیان میں صحت وجامعیت کا پورا لحاظ رکھا گیا ہے اور بعض نازک مرحلوں پر اعتدال کی راہ اختیار کرنے کی کامیاب کوشش کی گئی ہے۔ اسی کے ساتھ ہر خلیفہ کے دورِ حکومت اور اس کی خصوصیات پر بصیرت افروز تبصرہ کیا گیا ہے۔

کتاب کی ترتیب تاریخ نویسی کے جدید اصول پر کی گئی ہے جن اصحاب نے خلافتِ راشدہ کا مطالعہ کیا ہے وہ کتاب کے اس حصہ کی خصوصیتوں کا اچھی طرح اندازہ کرسکتے ہیں۔

کالجوں اور سکولوں کے نصاب تعلیم میں شامل ہونے کے قابل کتاب ہے۔ زبان سہل اور اندازِ بیان نہایت شگفتہ ہے۔

صفحات ۳۲۸ قیمت تین روپے مجلد تین روپے بارہ آنے۔

منیجر ندوۃ المصنفین دہلی قرول باغ

© rasailojaraid.com